

برصغیر ہندوستان میں اسلامی تحریک کی تاریخ

(مولانا مسعود عالم صاحب ندوی)

[یہ وہ مقالہ ہے جو مولانا نے جماعت اسلامی پاکستان کے اجتماع عام منعقدہ کراچی میں پیش فرمایا تھا]

ہندوستان میں اسلام کی عام حالت | یوں تو ہندوستان پہلی صدی ہجری ہی میں اسلام کی روشنی سے منور ہو چکا تھا، اور یہ سرزمین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بابرکت قدموں سے بھی محروم نہیں رہی تھی، پر یہ بھی حقیقت ہے کہ آفتاب اسلام کی پہلی کرنیں ساحلی علاقوں سے آگے نہ بڑھ سکیں عرب تاجر اور جہازران جو جنوب مغربی ساحل سے گزر کر سیلون اور جزائر شرق الہند کا رخ کرتے تھے، ملک کے اندرونی علاقوں میں کم آتے۔ اسی طرح سندھ کا نامور فاتح محمد بن قاسم بھی اپنی ہم کو ادھورا چھوڑ کر واپس لوٹنے پر مجبور ہوا۔ اس ملک اور خاص کر شمالی خطے کی بے نصیبی کہیے، کہ یہ عرب فاتحوں کے دم قدم سے محروم رہا۔ ان کی جگہ، اس کے حصے میں ایسے فاتح اور کشور کشا آتے، جو خود سنتے سنتے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ یہ ترک اور منہل فاتح، اسلام بھی اس وقت لاتے جب خود اس کے تہذیبی مرکزوں (حجاز، عراق، شام) میں انحطاط رونما ہو چکا تھا اور عباسی حکومت نو مسلم غلاموں کے ہاتھوں میں بچوں کا کھانا بن گئی تھی۔ یہ لوگ عام طور پر اسلام کے قافلوں جنگ سے ناواقف تھے اور ان کی فوج میں بڑی تعداد نو مسلموں کی تھی۔ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے حالت اور بھی خراب تھی۔ محمود غزنوی سے پہلے ان کے ہاں مدارس کا رواج ہی نہیں تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ نہ خیر سے آنے والی اشرقیہ اسلامی تعلیمات اکثر بے بہرہ رہیں۔ ان بادشاہوں اور کشور کشاؤں کے کارنامے ملک گیری اور جنگی صلاحیتوں کے لحاظ سے جو بھی قدر و قیمت رکھتے ہوں، مگر اسلامی تعلیم اور اسلامی نظام حکومت و عدل کے عملی مظاہرے کے اعتبار سے ان کی کوئی خاص قیمت نہیں۔ بلکہ تلخ بیانی معاف، ان بادشاہوں کی عملی زندگی اور ان کے سیاسی طرز عمل نے اسلام کے متعلق ایسی بے شمار غلط فہمیاں پیدا کر دیں، جو ایک مدت کی مسلسل اور

پیہم کوششوں کے باوجود آج تک مُرد نہیں ہو سکی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس ملک کے بڑے خطے کے حصے میں اسلام کے ایسے پیام برائے جو خود اسلام کی تعلیم سے اچھی طرح واقف نہ تھے، اور تھوڑی بہت واقفیت تھی بھی، تو اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق انہیں کم ہی میسر ہوئی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ وہ دین جو ایک عقیدہ اور ہمہ گیر نظام زندگی کی حیثیت سے تمام ادیان اور نظام ہائے حیات پر غالب ہونے کے لیے آیا تھا، ہندوستان پہنچ کر شرک اور جاہلیت کے انبار میں دب کے رہ گیا۔ حجاز سے توحید کا جو صاف و شفاف چشمہ رواں ہوا تھا، گنگا اور جمنا کی آمیزش نے اسے گدلا کر دیا، توحیدی عقائد شرک کی آلودگیوں میں لت پت ہو گئے، اور دین حق کا سُتھرا نظام زندگی جاہلیت کے طور طریقوں سے بُری طرح مسخ ہوا۔

ہم یہ جانتے ہیں، اور خود اس ملک کے غیر مسلموں نے بھی اسے مانا ہے، کہ اس سرزمین پر اسلام کے بڑے احسانات ہیں۔ لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس سرزمین میں اسلام پر بڑے ظلم ہوئے ہیں۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں اور یہاں اسلام قبول کرنے والوں نے اپنی کوتاہیوں کے باوجود جتنا کچھ بھی اسلام کا علم چھڑایا اور جس قدر بھی تھوڑا یا بہت، اس پر عمل کیا، اُس کی بدولت یہاں کے عقائد، اخلاق، تمدن اور تہذیب میں بڑی اصلاحات رونما ہوئیں، تو اُس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ یہاں کے جو اثرات بیرونی مسلمانوں نے قبول کیے اور جو اثرات ملکی مسلمانوں میں باقی رہے، انہوں نے نہ صرف اسلامی نظام زندگی کو مسخ کیا بلکہ خود اسلام کے عقائد اور تصورات و نظریات تک میں غلط فہم کی آمیزشیں کر دیں۔ یہ وہ خرابی ہے جسے زمانہ گذشتہ میں ہر دور کے مصلحین نے محسوس کیا ہے اور اسے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ خصوصاً حضرت مجدد الف ثانی (۳۲۰ھ) کے عہد سے لے کر آج تک سارے تین سو برس ہو چکے ہیں کہ اس کی اصلاح کی مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں، مگر اس کے باوجود صدیوں کا یہ بیٹھا ہوا زنگ پُوڑی طرح دُور نہیں ہو سکا۔

دسویں صدی ہجری [سرزمین ہند میں اسلام کی یہ عام حالت تھی کہ ہمیشہ ہر دور میں ہندوانہ اسلام

دل و دماغ پر چھایا رہا، مگر دسویں صدی ہجری سے پہلے کفر و شرک کی یہ تاریکی اپنی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ گجرات اور سندھ کے ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر، جن کے تعلقات عرب ملکوں سے قائم تھے، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ تصوف کو اثراتی اور ویدانتی فلسفوں نے بگاڑ کر رکھ دیا تھا، ہر طرف بدعات کی گرم بازار می تھی۔ زندگی کا کوئی شعبہ مشرکانہ اثرات سے پاک نہیں رہا تھا۔

اس زبوں حالی کی بڑی وجہ کتاب و سنت کی تعلیم سے غفلت اور بے پروائی تھی۔ اس غفلت کا بڑا سبب یہ ہے کہ شمالی ہند میں دین کی طرح علم بھی ماوراء النہر سے آیا یعنی اسباب کے تحت علمائے ماوراء النہر کی علمی پرواز فقہ اور اصول فقہ سے آگے نہیں بڑھی۔ اس لیے شمالی ہند میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ فقہ و اصول فقہ تک محدود رہا، اور یہاں بھی فقہاء کے غمتوں کو اصل دین کی سی اہمیت دی جانے لگی۔ قرآن و حدیث سے بے خبری کی صورت میں ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا۔ گجرات اور ساحلی علاقوں میں عرب ملکوں سے اہل علم کی آمد کا سلسلہ جاری تھا، اس لیے وہاں تو حَدَّث ثَنَاءً وَ اُخْبَرْنَا کا غلغلہ بلند ہوتا رہا، مگر اس خوش نصیب علاقے میں بھی حدیث و سنت کی چہل پہل اسی وقت تک رہی جب تک شمالی ہند کا سایہ اس پر نہیں پڑا۔ بیچ کی دو صدیوں (۷۹۹ھ - ۹۸۰ھ) میں وہ مرکزی حکومت کے دباؤ سے محفوظ رہا اور علم و عمل کی خوب گرم بازار می رہی۔ جب اکبر (۹۶۴ھ - ۱۰۱۴ھ) نے گجرات کا صوبہ بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تو وہاں بھی وہی چہل و تار کی لوٹ آئی۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ شمالی ہند کے کان حدیث سے بالکل نا آشنا رہے۔ البتہ عرض یہ کرنا ہے کہ شیخ عبدالحق (ف ۸۵۲ھ)، بلکہ شاہ ولی اللہ دہلوی (ف ۱۱۷۶ھ) سے پہلے اس خطے میں حدیث کا عام چرچا نہیں ہوا۔ دسویں صدی ہجری سے پہلے شمالی ہند میں صرف ایک جلیل القدر محدث حسن، ف ۶۵۰ھ، کا نام ملتا ہے۔ پھر تین صدیوں کے بعد شیخ علی متقی (ف ۹۷۵ھ) ہند درس پر جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان دونوں اور ان کے کارناموں سے شمالی ہند کے ارباب اقتدار اور اصحاب علم کی کوتاہیوں کا کفارہ نہیں ہو سکتا۔

دسویں صدی ہجری تک اس برصغیر کی عام حالت یہی تھی۔ گو اللہ کی زمین نیک بندوں سے بالکل خالی بھی نہیں رہی۔ صلواتی امت انفرادی طور پر تبلیغ و دعوت کا کام کرتے رہے۔ بادشاہوں میں محمد تغلق (۶۲۵-۷۵۲ھ)، فیروز تغلق (۷۵۲-۷۹۰ھ) اور سکندر لودی (۸۹۴-۹۲۳ھ) کے نام ملتے ہیں، جنہوں نے اپنی صوابدید اور محبت کے مطابق صورت حال کے بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ صحیح الفکر اہل علم کے فقدان، دین سے عام بھری اور خاص طور پر اسلام کے ملکی اور جنگی قانون سے پوری واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ بسا اوقات ایسے کام بھی کر جاتے تھے جن کی قانون شریعت کے اندر مشکل ہی سے گنجائش نکل سکتی ہے۔ چہرے اس کے باوجود ہندوستان کی تاریخ میں ان نیک دل اور خدا ترس بادشاہوں کا ایک خاص مقام ہے جسے اسلامی تحریک کا مؤرخ کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔

دسویں صدی ہجری سے پہلے کی ان اصلاحی اور تبلیغی کوششوں میں علماء کا حصہ نمایاں نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح عالم دین بہت کم تھے، اور جو تھے اُن کا بھی بڑا حصہ اپنے فرائض سے بالکل غافل تھا۔ اہل بیت جیسا کہ ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے، کچھ باعمل اور خلوت نشین صوفی ضرور تھے، جو اپنی اپنی جگہ دعوت و تبلیغ میں مصروف تھے۔ اور یہ ان ہی بزرگوں کی خاموش دعوت کا اثر ہے کہ اس ملک میں اسلام کی بوباس نظر آتی ہے۔ لیکن یہ خلوت نشین اور شب زندہ دار صوفی نہ ایسے ذرائع رکھتے تھے کہ یہاں کے عوام میں اسلام کا علم وسیع پیمانے پر پھیلا سکتے، اور نہ حکومت کی مدد کے بغیر یہی ممکن تھا کہ تنہا ان کی کوششوں سے مسلمانوں کی روز افزوں آبادی بدعات اور شرکاء غفائد اور جاہلیت کی رسموں سے محفوظ رہتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ان بزرگوں کے فیض نظر سے داخل اسلام ہوتے تھے، وہ خود ان ہی بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا بیٹھے۔ اور جہالت نے انہیں مرکزوں کو بدعات کی آماجگاہ بنا کر چھوڑا جہاں سے خلق خدا کو اسلام کی نعمت نصیب ہوتی تھی۔

دورِ خلافت ۹۶۴-۱۰۱۴ھ | دسویں صدی ہجری اور اس سے پہلے جو مسلمان بادشاہ تخت

حکومت پر سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے وہ کم سے کم دین سے عناد نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ ان میں محمد تعلق اور فیروز تعلق جیسے صالح اور درو مند فرمانروا بھی ہوتے ہیں، جنہوں نے دین کی خدمت اور اصلاح حال کی اپنی سی کوشش میں کوتاہی نہیں کی۔ مغلوں کا رنگ شروع ہی سے بدلا ہوا تھا۔ خود تیمور نے قتل و غارت میں مسلمان اور کافر کے درمیان کوئی تمیز نہیں کی۔ ہمایوں اپنی پریشاں مالی اور گشتگی کے بعد ایران سے واپس آیا تو ایسا تحفہ لے کر، جو بعد میں اسلامی ہند کا ایک پیچیدہ اور متقل مثل بن گیا۔ لیکن جس مغل بادشاہ کے دور میں اسلام اور مسلمانوں پر زمین تنگ کرنے کی کوشش کی گئی اور دین و شعائر دین کی بے حرمتی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا گیا، وہ اکبر ہے۔

یہ نو عمر اور ان پڑھ بادشاہ ۹۶۲ھ میں تخت و تاج کا وارث ہوا اور اس نے پورے پچاس برس حکومت کی۔ اس کے کان میں کسی شیطان نے پھونک دیا کہ "اب نبی عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کو ہزار سال ہو رہے ہیں، دوسرے ہزار میں نئے دین اور نئے مذہب کی ضرورت ہے۔ وہ پرانا دین اب کام نہیں دے سکتا۔ جادو کام کر گیا اور گم کردہ راہ مصاحبوں اور درباریوں کی سازش سے ایک نئے مذہب (دین الہی) کی ذریعہ پیل پڑنا شروع ہو گئی۔ بادشاہ کی خدمت میں ایک محض نامہ پیش کیا گیا ۹۸۰ھ، جس کا مضمون یہ تھا کہ "بادشاہ ظل اللہ ہے۔ امام عادل ہے مجتہد العصر ہے کسی کا پابند نہیں۔ اس کا حکم سب پر بالائے خلاصہ یہ کہ اسے معصومیت کی سند دے دی گئی اور وہ آئے دن دین میں من مانی ایجادات کرنے لگا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ اس نے شیعہ مذہب بھی اختیار کیا تھا اور سنی علماء پر بڑی سختیاں کی تھیں بعض کہتے ہیں کہ وہ تصوف کی طرف مائل تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہم اسے مذہب کے باب میں خطی کہہ سکتے ہیں۔ آفتاب اور آگ کے سامنے ہر عقیدت خم کرنا بھی اس سے منقول ہے۔ حضرت مریم کو معبود بنانا اور شاعروں کی پرستش بھی اس کی طرف منسوب ہے۔ اور تو اور اپنی عقل کو بھی وہ معصوم سمجھنے لگا تھا۔

اس خبط اور دماغی عدم توازن کے ساتھ اسلام اور شعائر اسلام سے اس کی نفرت بھی عکس

زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ ملازموں کو محمد اور احمد کے ناموں سے پکارا کرتا کہ دغا کم بہن! مقام نبوت کی تخفیف ہو بھری تقویم کے بدلے الہی تقویم، جاری کی جس کا آغاز اس کی تخت نشینی کے سال سے کیا گیا۔ شراب اور قمار بازی کے کھلم کھلا مباح کرنے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ گاؤں کشی بالکل بند کر دی گئی۔ مسجدیں بھی منہدم کی گئیں۔ — دوسری طرف غیر مسلم بی بیوں کی وجہ سے قصر شاہی میں ہندو تہذیب و معاشرت کا سکہ چلنے لگا۔ ان کے یہ قصر میں خاص عبادت خانے بنائے گئے۔ بتوں کی پوجا کا باقاعدہ انتظام ہوا۔ ہندو تہواروں کے موقع پر عام عید منائی جاتی مختصر یہ کہ سارا ماحول ہندوانہ ہو گیا۔ فتنہ اکبری کی تفصیل کے لیے ایک ذکر چاہیے۔ اس مختصر تحریر میں سرسری اشارے ہی کیے جاسکتے ہیں۔ البتہ ایک چیز رہی جاتی ہے جس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ دودیا اکبری کی اس گمراہی اور کج روی کا بڑا سبب علماء سود ہیں۔ ان کی باہمی رقابت، مال و متاع دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی طلب، اور اس پر دین کے سطحی علم نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ یہ ان علماء سود کی پست سمجھتی، بزدلی اور دنیا طلبی ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ایک ایسے محضر نامہ پر دستخط کر دیے، جو حقیقت میں دین و مذہب کا ”قتل نامہ“ تھا۔ اس لیے یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اس فتنہ کی پرورش و پرداخت میں علماء سود کا بڑا حصہ تھا۔ دودیا اکبری کے ابن حنبل، حضرت مجدد الف ثانیؒ بالکل بجا ارشاد فرماتے ہیں :-

”ہر فتویٰ کہ دریں زمان و ترمیج ملت و دین ظاہر گشتہ از شومئی علماء سود است

کہ فی الحقیقت شرار مروج و مخصوص دین اند۔ او کثرت حزب الشیطن۔ الا اذ

حزب الشیطن هم الخبیثون“

مجدد الف ثانیؒ ۹۷۷ھ - ۱۰۳۴ھ | اب ہم ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے اُس موڑ پر پہنچ گئے

ہیں جہاں سے صحیح اسلامی رہنمائی شروع ہوتی ہے۔ زمین پتی ہے تو باران رحمت کا نازل ہوتا ہے۔ جب اکبری دور کی فتنہ سامانیاں حد سے بڑھ گئیں اور سچے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہونے لگا، تو قدرت نے ایک درویش کو خلعت تجدید عطا فرمایا، جس نے دیوتاؤں کی اس سرزمین میں پہلی تریح صحیح اسلامی رہنمائی کا علم بلند کیا، کفر و شرک کی اندھیاری میں کتاب و سنت کی شمع روشن کی، توحید

خالص کا بول بالا کیا، اور سبے بڑھ کر یہ کہ ”افضل الجہاد“ کی سنت زندہ کی۔۔۔۔۔ آپ سمجھے! یہ درویش کون تھا؟ احمد بن عبدالاحد فاروقی سرہندی، مجدد الف ثانیؒ۔ ان کی ہڈیاں پھولوں میں رہیں! سچ یہ ہے کہ وہ مجدد کے جانے کے مستحق ہیں۔ حسین بن علیؑ احمد بن حنبلؒ اور ابن تیمیہؒ نے اپنے اپنے زمانوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے تھے، وہی خدمت اس پوریائشیں رویش تمام دی اور اسی نشان استغناء و محبوبیت کے ساتھ جو ازل سے مقربین بارگاہ کا خاصہ رہا ہے۔

مجدد صاحبؒ کی نشو و نما دسویں صدی ہجری کے اواخر میں ہوئی۔ وہ سن رشد کو پہنچتے ہی اس وقت کے عواقب کو بھانپ گئے اور اس کے مقابلے کے لیے تیاری شروع کر دی۔ دور و نزدیک ہر طرف مریدوں کا جال پھیلا دیا۔ حکومت کے افسروں اور فوج کے سپہ سالاروں پر تبلیغ شروع کر دی لیکن ان کی دعوت کے اثرات جہانگیر کے عہد حکومت میں ظاہر ہوئے، جبکہ یہ فتنہ پورے شباب پر تھا۔ اس وقت وہ کھل کر میدان میں آ گئے۔ منکرات و بدعات کی بیخ کنی میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ بے شمار مخلوق خدا آپ کے ہاتھوں ہدایت پذیر ہوئی۔ اول اول تو حکومت نے سختی نہ کی، مگر جب کلمہ حق و اشکاف بلند ہوا تو جبین اقتدار پر شکن آ گئی۔ دربار میں طلبی ہوئی۔ مجاہد نے وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا۔ انسان، انسان کو سجدہ کرے، ایک موحّد یہ کس طرح برداشت کر سکتا ہے؟ حضرت مجددؒ نے سب دربار ان بدعات و منکرات کی مذمت کی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیئے گئے۔ مگر مدتی آگاہ وہاں بھی اپنے کام میں مشغول رہا۔ دیکھتے دیکھتے قید خانہ کی کایا پٹ ہو گئی۔ تب حکومت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بادشاہ نے دعوت دی۔ دلی عہدے استقبال کیا۔ وقت کے مصلح و مجددؒ نے ان موقعوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور دور اکبری کی منکرات و بدعات کی فسوخی عمل میں آ گئی اور تقریباً نصف صدی کی گھٹا ٹپ تاریکی کے بعد ایک مرتبہ پھر اس ملک میں اسلام کو سر بلندی حاصل ہوئی۔

مجدد صاحبؒ نے جن چیزوں کی طرف خاص توجہ کی، وہ یہ ہیں :-

۱، سب سے پہلے ارکھن حکومت کی اصلاح کی طرف توجہ کی کہ ان کے دلوں میں دعوت جگہ پیدا کرے تو

پھر پوری قوم کا مائل ہو جانا دشوار نہیں۔ اور اس میں انہیں بڑی مدد کا میاںی ہوئی۔

(۲۲) انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام پر اس دور میں جو مصیبتیں آئی ہیں اور آ رہی ہیں ان میں علماء سود کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا بڑا دخل ہے۔ اس لیے انہوں نے ان کی پردہ دہی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اور اس کے مفید نتائج ظاہر ہوئے۔

(۲۳) اسی طرح انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے زمانے کے صوفیہ اکثر و بیشتر ویدانت کے فلسفے اور ہندو جوگیوں کی ریاضتوں سے متاثر ہیں، اور ان کی بڑی تعداد و وحدۃ الوجود اور ہمہ دوست جیسے مشترکات کی قائل ہو گئی ہے۔ حضرت مجدد نے ان جاہل صوفیوں اور ان کے گمراہ کن عقائد اور خاص کر وحدۃ الوجود کی کھلم کھلا اور بے لاگ تردید کی۔ اور یہ ان کا ایسا کارنامہ ہے جو اسلامی ہند کے فکری ارتقاء میں انہیں ایک خاص مقام عطا کرتا ہے۔

(۲۴) عرصہ دراز سے جاہل و اعطوں اور خوش عقیدہ مشائخ کا یہ شبوہ رہا ہے کہ جہاں انہیں کسی بدعت پر ٹوکا گیا، وہ بدعت حسنہ کی آڑ لے کر سامنے آ گئے۔ مجدد صاحب نے شاید اسلامی ہند میں پہلی مرتبہ اس کا پردہ چاک کیا۔ انہوں نے اپنے مکتوبات میں واضح گاف طریقہ پر بار بار بیان کیا ہے کہ بدعت بدعت ہے اور اس لیے منکرات بھی۔ اس میں حسنہ اور سیئہ کا کیا سوال؟ کیث بشعورنی من این حکموا بحسن البیدۃ الخدۃ فی الدین النکاح۔ مجدد الف ثانیؒ کا یہ کارنامہ بھی کوئی معمولی کارنامہ نہیں خصوصیت کے ساتھ یہ دیکھ کر مجدد صاحب کے اس کارنامے کی وقعت اور بڑھ جاتی ہے کہ بدعت حسنہ کے سلسلے میں بڑے بڑے علماء نے ٹھوکیں کھائی ہیں۔ وحدۃ الوجود کی بے لاگ تردید اور بدعت حسنہ کی پردہ دہی، مجدد صاحب کے یہ ایسے شاندار کارنامے ہیں، جو صرف اسلامی ہند بلکہ پوری اسلامی فکر کی تاریخ میں انہیں خاص مقام عطا کرتے ہیں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تانہ بخشد خدا سے بخشندہ

شیخ عبدالحق دہلویؒ ۹۵۸-۱۰۵۲ھ [مجدد صاحب کے تجدیدی کارناموں کے ساتھ ان کے صاحبِ علم معاصر شیخ عبدالحقؒ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ ان کی ذات سے شمالی ہند میں علمِ حدیث